دی علم فاؤنڈیشن کے مرتب کردہ نصاب
"مطالعہ قرآن حکیم برائے طلباء و طالبات" پر

طائرانہ نظر

از قلم:

سید ارشد سعید کاظمی

شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ انوار العلوم ملتان، پاکستان

سینئر نائب صدر تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان

مہتمم اعلیٰ جامعات السعید پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان کی مجلس عاملہ کے ۱۰،اگست ۲۰۱۶ء کے اجلاس میں صدر محترم حضرت علامہ پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی نے سرکاری تعلیمی اداروں میں ترجمۂ قرآن پڑھانے کے حوالے سے محکمہ تعلیم کی طرف سے تجویز کردہ نصاب کے متعلق ابتدائی معلومات فراہم کیں۔فقیر نے ان سے کہا کہ ہمیں ایک سیٹ فراہم کیا جائے تاکہ اس کا جائزہ لیا جاسکے تو انہوں نے فرمایا آپ کو ایک سیٹ بھیجا جائے گا۔کچھ دن گزرنے کے بعد فقیر نے پھر یاددہانی کرائی کہ اس نصاب کا ایک سیٹ ہمیں بھجوایا جائے۔تو حضرت مفتی صاحب قبلہ کی طرف سے ۲۰،اگست ۲۰۱۶ کو ایک نامکمل سیٹ موصول ہوا جو دو قسموں پر مشتمل ہے۔پہلی قسم''مطالعہ قرآن حکیم برائے طلباء وطالبات'' جو سات حصوں پر مشتمل ہے اس میں سے پانچ حصے ہمیں مہیا کیے گئے ہیں جبکہ دوسری قسم ''رہنمائے اساتذہ،مطالعہ قرآن حکیم برائے طلباء وطالبات'' جس کا مقصد اساتذہ کرام کی تدریسی رہنمائی کے لئے عمومی ہدایات ہیں۔اس کے صرف تین حصے بھجوائے گئے ہیں۔

نصاب کا عنوان''مطالعہ قرآن حکیم برائے طلباء وطالبات'' ہے اور ظاہر ہے قرآن مجید کا اپنا ایک خاص اسلوب اور انداز بیان ہے۔مضامین قرآن میں اوامر بھی ہیں،نواہی بھی،قصص وامثال بھی ہیں وعدہ ووعید بھی،حلال وحرام بھی ہے اور ادعیہ وغیرہ بھی۔اس میں جہاں سزا کا ذکر ہے ساتھ ہی جزا کا ذکر ہے اگر کہیں شر،کا ذکر ہے تو خیر کا ذکر بھی ساتھ ہے اگر کفار ومشرکین کی کفر وشرک پر مبنی بداعمالیوں اور ان پر مرتب ہونے والے عبرت ناک انجام کا ذکر ہے تو اہل ایمان اور صالحین ومتقین کی عظمت وشان اور آخرت میں ان کی عزت وکرامت اور ان کے لئے نعمہائے جنت کا ذکر بھی ساتھ ساتھ ہے قرآن مجید میں اگر توحید باری تعالیٰ اور عقیدہ آخرت کا ذکر ہے تو اس کے ساتھ ساتھ مقدس جماعت،حضرات انبیاء کرام ورسل عظام علیہم السلام کی رفعت ووجاہت،علو مرتبت،ان کی اطاعت واتباع اور تعظیم وتوقیر بجالانے کا حکم بھی قرآن حکیم میں ہے۔جب کہ آج کل یوں بھی ہوتا ہے کہ جب عقیدۂ توحید باری تعالیٰ کی بات کی جاتی ہے یا معبودان باطلہ کا تذکرہ ہوتا ہے تو اسے بڑی تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔لیکن انبیاء ومرسلین علیہم السلام اور اہل اللہ وصالحین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان محبوبیت اور اللہ کی طرف سے انہیں عطا کردہ خصوصی عظمت وفضیلت کی بات آتی ہے تو اسے نظر انداز کردیا جاتا ہے۔بالکل اسی انداز پر زیر بحث نصاب''مطالعہ قرآن حکیم برائے طلباء وطالبات'' میں مباحث کا ارتکاز عقیدۂ توحید وایمان بالآخرت کی وضاحت اور کفار ومشرکین اور منکرین توحید وآخرت کی مذمت پر ہے۔اس کے برعکس حضرات انبیاء کرام بالخصوص سید المرسلین نبی اکرم ﷺ کے مقام ومرتبہ اور عظمت وشان (جو خود کلام الٰہی کی متعین کردہ ہے) کے ذکر سے یا تو صریحاً گریز واجتناب کیا گیا ہے یا ایسا انداز بیان اختیار کیا گیا ہے جس سے اس نصاب کے مطالعہ کرنے والے طلباء وطالبات کے دلوں میں حب رسول جاگزیں اور عظمت رسول نقش نہیں ہوسکے گی۔حیرت اور تاسف اس بات پر ہے کہ یہ اسلوب اس واضح فرمان نبوی کے باوجود اختیار کیا گیا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"لا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْن" (بخاری ومسلم)

(تم میں سے کوئی (شخص اس وقت تک) مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اسے اس کے والد اور اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں)

جبکہ اس نصاب کو پڑھ کر یہی تصور ابھرتا ہے کہ نبی ورسول بھی ہماری طرح کا بندہ، بشر وانسان ہوتا ہے اور جس طرح عام انسانوں سے غلطیاں ہوتی ہیں ان سے بھی خطائیں سرزد ہوتی رہی ہیں اور وہ اپنی غلطیوں اور خطاؤں پر نادم ہو ہو کر معافی اور توبہ کرتے رہے ہیں بلکہ جگہ جگہ آیات کا ترجمہ ہی ایسا کیا گیا جس سے یہ نظریہ فروغ پائے۔

سلسلہ کلام آگے بڑھانے سے پہلے یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ۱۹۴۴ء سے ہمارے ادارہ کی تاریخ گواہ ہے کہ ہم لوگ نہ منفی ذہنیت رکھتے ہیں، نہ ہی کسی کے متعلق خوامخواہ بدگمانی کو راہ دیتے ہیں اور نہ ہی بے جا کسی کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن ہم لوگ مخالفین کی چالوں سے مکمل طور پر واقف اور آگاہ ہوتے ہیں اور انکے عزائم کو بھانپ لیتے ہیں اور جن مقاصد کا حصول ان کا منتہا ہوتا ہے بفضل اللہ انہیں آشکار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میری مراد جامعہ اسلامیہ عربیہ انوار العلوم ملتان (پاکستان) ہے جس کے بانی غزالی زماں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ آپ تنظیم المدارس پاکستان کے بھی بانی تھے۔ اس کے موجودہ مہتمم جماعت اہلسنت پاکستان کے مرکزی امیر، جانشین غزالی زماں حضرت علامہ پروفیسر سید مظہر سعید کاظمی دامت برکاتہم العالیہ ہیں۔

دی علم فاؤنڈیشن کے مرتب کردہ نصاب پر ایک مختصر لیکن حقائق پر مبنی جامع جائزہ "مشتے از خروارے" کے طور پیش کریں گے۔

یہ جائزہ مصدقہ حوالہ جات اور دلائل سے آراستہ ہے آخر میں تجزیہ اور چند اہم تجاویز بھی شامل ہیں۔

سردست چند قابل توجہ آیات پیش خدمت ہیں۔ ان کے ترجمہ وتشریح پر غور فرمائیں

(۱) سورۂ فاتحہ آیت نمبر ۴ میں "نَعْبُدُ" کی تشریح میں عبد کا مطلب غلام بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ رہنمائے اساتذہ حصہ اوّل صفحہ نمبر ۲۸ پر لکھا ہے کہ "عبادت کا لفظ عبد سے بنا ہے جس کا مطلب "غلام" ہے جو اپنے آقا کی ہر بات مانتا ہے"۔۔۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آیت کریمہ میں لفظ ہے "نَعْبُدُ" جس کا مصدر عبادۃ ہے نہ کہ "عبد"۔ اس کے معنی پوجنے اور عبادت کرنے کے ہیں اور "نَعْبُدُ" کا معنی ہے، ہم عبادت و پوجا کرتے ہیں، کریں گے یہاں دور از کار تاویل وتشریح کی کیا ضرورت تھی کیونکہ لفظ عِبَادَۃ خود مصدر ہے اس کا لفظ عَبْد سے مشتق ہونا اور بننا کسی طرح درست نہیں اس لئے کہ علماء بصریین کے نزدیک مصدر اصل ہے اور فعل مصدر سے بنتا ہے جبکہ کوفیوں کے نزدیک مصدر کی اصل فعل ہے اور عبد نہ تو مصدر ہے اور نہ ہی فعل کہ اس کو عبادت کیلئے اصل قرار دیا جاسکے اور کہا جائے کہ عبادۃ کا لفظ عبد سے بنا ہے بلکہ عبد تو صفت ہے جو کہ کبھی اسم کی جگہ بھی استعمال ہو جاتا ہے۔

اور "عَبَدَ یَعْبُدُ عِبَادَةً" کا اطلاق صرف عبادت وبندگی کیلئے ہوتا ہے چاہے وہ اللہ کیلئے ہو یا غیر اللہ کیلئے۔ وہ عبد جو اپنے مولا کی خدمت کرتا ہے اس کیلئے یہ نہیں کہا جاتا کہ "عَبَدَہٗ" (اس نے اس کی خدمت کی)۔ جیسا کہ لسان العرب جلد نمبر ۳، ص ۲۷۱ پر لکھا ہے۔

لَایُقَالُ عَبَدَ یَعْبُدُ عِبَادَۃً اِلَّالِمَنْ یَّعْبُدُ اللّٰہَ وَمَنْ عَبَدَ دُوْنَہٗ اِلٰھًافَھُوَ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ قَالَ: وَاَمَّاعَبْدٌ خَدَمَ مَوْلَاہُ فَلَا یُقَالُ عَبَدَہٗ

ترجمہ: عَبَدَ یَعْبُدُ عِبَادَۃً اس کے لیے بولا جاتا ہے جواللہ کی عبادت کرے اور (اسکے لیے بھی بولا جاتا ہے) جس نے اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت کی پس ایسا کرنے والا خسارہ پانے والوں میں سے ہے۔اور بہرحال ایسا عَبْـــد (غلام) کہ جس نے اپنے مولا یعنی آقا کی خدمت کی اس کے لیے عَبَدَہٗ کے الفاظ نہیں بولے جاتے ہیں کہ ''اس غلام نے اپنے آقا کی خدمت کی''۔

لٰہذا اس آیت میں '' نَعْبُدُ '' جو عبادۃ سے ماخوذ ہے اوراس میں جو عبدیت کے معنٰی پائے جاتے ہیں اس کا مفہوم لفظ غلام پورا نہیں کرتا بلکہ بندے کا لفظ ہی اس کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

مزید یہ بھی واضح رہے کہ عبد کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو یعنی اللہ کا عبد۔تب عبد کے معنی بندے کے ہوتے ہیں اور اس کے معنٰی غلام کے نہیں ہوتے۔لیکن جب اس کی نسبت کسی بندے کی طرف ہو جس طرح پہلے زمانے میں جنگوں وغیرہ میں جو غلام بنائے جاتے تھے ان کی خرید وفروخت ہوتی تھی تو اس کے معنٰی غلام کے ہوتے ہیں۔اس لئے ہمارے عرف میں یوں نہیں کہا جاتا کہ میں اللہ کا غلام ہوں بلکہ یوں ہی کہا جاتا ہے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔

اگر عبد کا مطلب غلام لیا جائے تو اس سے یہ نظریہ بھی فروغ پائے گا کہ غلام رسول، غلام محمد، غلام علی، غلام حسن اور غلام حسین جیسے نام رکھنا جائز نہیں ہیں کیونکہ کوئی بھی انکا عبد نہیں ہے۔واضح رہے کہ ان ناموں میں ''غلام'' خادم اور نوکر کے معنی میں ہے اور جب ہمیں صحابہ کا نوکر کہلانے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی بلکہ فخر ہوتا ہے تو مذکورہ ناموں کے رکھنے میں کیا قباحت ہوسکتی ہے۔

(۲) سورۂ فاتحہ میں ''صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَاالضَّآلِّیْنَ'' کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے۔

'' ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام فرمایا۔جن پر آپ نہ غصہ ہوئے اور نہ جو گمراہ ہوئے'' (مطالعہ قرآن حکیم حصہ اول، ص ۶)

یہ ترجمہ انتہائی توجہ طلب ہے کیونکہ یہاں ''غصہ'' غضب کے مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر ہے ان الفاظ کے مفہوم میں اردو لغت میں جو واضح فرق ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔''غضب'' میں جو شدت پائی جاتی ہے اسکی ادائیگی کے لئے اردو میں لفظ غضب ہی بولا جائے گا کیونکہ اردو زبان میں کوئی لفظ اس کا مترادف نہیں۔غضب کے مفہوم میں شدت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے چاہے معاملہ اچھائی کا ہو یا ناراضگی کا جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ اس نے تو غضب کردیا۔ترجمہ کسی عبارت کے مفاہیم کو ایک دوسری زبان میں دیانتداری سے منتقل کرنے کا عمل ہے۔کتاب اللہ کے ترجمہ کیلئے تو احتیاط اور دیانت کے معیار کا تعین کرنے والا پیمانہ بھی ممکن نہیں۔لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ یہ نصاب ترجمہ کے جس معیار کا مظہر ہے وہ ایک عام کتاب کے ترجمہ کے تقاضے بھی پورے نہیں کرسکتا۔

اس ضمن میں ان آیات کی تشریح بعنوان ''علم وعمل کی باتیں'' میں دو نکات غور طلب ہیں

عنوان نمبر ۸ میں تحریر ہے

اللہ سبحانہ وتعالیٰ انبیاء کرام علیہم السلام سے خوش ہوتا ہے ہمیں بھی ان کی پیروی کرنی چاہئے۔

اور نمبر ۱۰ کے تحت لکھا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے طریقہ کو چھوڑنے والے گمراہ ہوجاتے ہیں، ہمیں انبیاء علیہم السلام کے طریقہ کو نہیں چھوڑنا چاہئے۔

(مطالعہ قرآن حکیم، حصہ اول، ص ۸)

یہ وضاحت گویا اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ مقدس حضرات کو صرف انبیاء کرام علیہم السلام تک محدود کررہی ہے۔ اگرچہ رہنمائے اساتذہ میں سوال وجواب کی صورت میں اس کی وضاحت کردی گئی لیکن اصل مقصود تو طلباء وطالبات ہیں۔ اس لئے اس کی تفصیل اس کے ساتھ ہی ہونی چاہئے تھی جو کہ نامعلوم وجوہات کی بناء پر نہیں کی گئی۔

مزید برآں یہ کہ جب مرتبینِ نصاب کا کہنا یہ ہے کہ اس نصاب میں فقہی مسائل کو نہیں چھیڑا گیا ہے۔ اس بات پر ہم اپنے تجزیئے میں گفتگو کریں گے مگر سردست عرض ہے کہ سورۂ فاتحہ کی تشریح میں بغیر کسی وضاحت کے مطلقا یہ جو لکھ دیا گیا ہے کہ ''اس کا مشہور نام سورۃ الفاتحہ ہے کیونکہ یہ قرآن حکیم کی افتتاحی سورت ہے اسے نماز کی ہر رکعت میں پڑھا جاتا ہے'' (مطالعہ قرآن حکیم، حصہ اول، ص ۶)

کیا یہ عبارت ایک خاص مکتبِ فکر کی ترجمانی نہیں کررہی ہے؟ اس عبارت کی بناء پر طالب علم یہی سبق حاصل کرے گا کہ میں امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہوں یا تنہا بہرکیف ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ شریف کی تلاوت کرنی ہے حالانکہ برصغیر کے اکثر مسلمان حنفی ہیں اور مسلک احناف یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ شریف کی قرأت نہیں کرے گا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ جس فاؤنڈیشن کے افراد نے سورۂ فاتحہ کے ترجمہ وتشریح میں اتنی زیادہ غلطیاں، کوتاہیاں کیں، ان کے باقی مرتب کردہ نصاب ''مطالعہ قرآن حکیم برائے طلباء وطالبات'' کی حقیقت کیا ہوگی۔

(۳) ''وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی'' ترجمہ۔ ''اور آدم اپنے رب کے حکم کو ٹال گئے پس (صحیح بات سے) ہٹ گئے''

(مطالعہ قرآن حصہ چہارم، ص ۳۴)

یہاں پر عصٰی کا ترجمہ ''ٹال گئے'' کرنا محل نظر ہے کیونکہ کسی کے حکم کو ٹالنے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ٹالنے والے کو مکمل حکم یاد اور بات متحضر ہوتی ہے، اس کے باوجود وہ جان بوجھ کر اس حکم کو قابل توجہ اور لائق التفات نہ سمجھے۔ اس لئے اس کا ترجمہ اہل لغت نے ''بہانہ کرنے'' سے بھی کیا ہے۔ عصیان بھولے سے بھی ہوتا ہے اور جان بوجھ کر بھی۔ حضرت آدم علیہ السلام کا عصیان بر بناء بھول تھا، جان بوجھ کر نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا'' ''تو وہ بھول گئے اور ہم نے ان میں (خطا کا) کوئی ارادہ نہیں پایا''۔

اور اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں کہ بھول کے عصیان کا وہ حکم نہیں جو کہ جان بوجھ کر عصیان کا ہے۔ اگر ہم ''عصٰی'' کا ترجمہ ''ٹال گئے'' کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آدم علیہ السلام نے جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ایسے

شخص کو اپنا خلیفہ منتخب فرمایا جو اس کا حکم ٹال گیا۔(العیاذ باللہ)

(۴) مطالعہ قرآن حکیم حصہ چہارم میں سورۃ الانبیاء آیت نمبر ۸۷ ''وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ'' کا ترجمہ کیا ہے

اور مچھلی والے (یونسؑ کو یاد کیجیے) جب وہ غصے کی حالت میں چلے گئے تو خیال کیا کہ ہم ان پر قابو نہیں پاسکیں گے۔

آیت کریمہ کے اس جملے (فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ) کا یہ ترجمہ ''تو خیال کیا کہ ہم ان پر قابو نہیں پاسکیں گے''۔قابل توجہ ہے کیونکہ یہاں لفظ''لَّنْ نَّقْدِرَ''قدرت کے معنی میں نہیں کہ اس کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ ہم ان پر قابو نہیں پاسکیں گے یا ان کو پکڑ نہ سکیں گے بلکہ لفظ''نَّقْدِرَ''تنگی کے معنی میں ہے۔قرآن کریم میں یہ لفظ کئی مقامات پر تنگی کے معنی میں آیا ہے مثلاً يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ (سوۂ شوریٰ، آیت ۱۲)''جس کے لئے چاہے (اللہ) رزق فراخ کردیتا ہے اور (جس کے لئے چاہے اس کے رزق کو) تنگ کردیتا ہے نیز ''وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُه''(سورۂ طلاق کی آیت ۸) اور جس پر اس کا رزق تنگ کردیا گیا۔امام راغب اصفہانی نے''لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ'' کی تفسیر کرتے ہوئے مفردات میں فرمایا:''اَیْ لَنْ نُّضَيِّقَ عَلَيْهِ''یعنی یونس علیہ السلام نے گمان کیا کہ ہم ان پر ہرگز تنگی نہ کریں گے (مفردات، ص۴۰۴)۔

ایک عام مسلمان بھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اللہ تعالیٰ اس پر قابو نہ پاسکے گا یا اسے نہیں پکڑ سکے گا چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کے نبی یونس علیہ السلام یہ سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر قابو نہ پاسکے گا۔اس میں تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نفی ہے اور ایسا سمجھنا یا گمان کرنا نبی کی شان کے لائق نہیں۔اگر یوں کہا جائے جس نے یہاں''لن نقدر''کا ترجمہ قابو نہ پاسکیں گے یا قادر نہ ہوسکیں گے کیا تو اس نے تو بقول امام اللغات صاحب لسان العرب جمال الدین محمد بن مکرم ابن منظور، کفر کیا کیونکہ اس نے ایسا کہہ کر حضرت یونس علیہ السلام کی طرف کفر کی نسبت کی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کیا کہ ہم ان پر قابو نہ پاسکیں گے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کرنا کفر ہے۔

ملاحظہ ہو! صاحب لسان العرب فرماتے ہیں۔فاما ان یکون قوله ان لن نقدر علیه من القدر ة فلا یجوز لان من ظن هذا كفر والظن شك والشك فی قدرة الله تعالیٰ كفر وقد عصم الله انبیاء ہ عن مثل ما ذهب الیه هذا المتأول ولا یتأ ول مثله الا الجاهل بكلام العرب ولغاتها (لسان العرب جلد نمبر ۵ ص ۷۷)

ترجمہ''نَقْدِرَ''کو قدرت سے (ماخوذ) ماننا جائز نہیں کیونکہ جس نے یہ گمان کیا (کہ اللہ اس پر قابو نہیں پاسکے گا یا اللہ کو اس پر قدرت نہیں) اس نے کفر کیا اس لئے کہ ظن (گمان) کرنا شک ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کرنا کفر ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام کو کفر سے معصوم بنایا ہے اور اس معنی کی یہ تاویل وہی شخص کرے گا جو کلام عرب اور اس کی لغات سے جاہل ہے۔

(۵) رہنمائے اساتذہ حصہ سوئم صفحہ ۲۲۵، آیت بہ آیت تشریحی نکات کے ضمن میں سورۂ قلم کی آیت نمبر ۵۰ کے تحت سوال لکھا۔

حضرت یونس علیہ السلام کا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں کیا مقام ہے؟

جواب میں لکھا۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انہیں چن لیا اور وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کامل نیک بندوں میں سے ہیں یعنی پھر ان کا اور زیادہ رتبہ بڑھایا اور اعلیٰ درجہ کے نیک اور صالح لوگوں میں شامل فرمایا۔انہیں دوبارہ رسالت سے نواز کر انہیں اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا۔

خط کشیدہ عبارت میں لفظ ''دوبارہ'' قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ''انہیں دوبارہ رسالت سے نواز کر انہیں اپنی قوم کی طرف بھیجا'' اس جملے کا مطلب کیا ہے؟ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نبوت ورسالت سلب فرمائی تھی کہ پھر انہیں دوبارہ منصب رسالت پر فائز کیا گیا۔اب سوال یہ ہے کہ ان سے کون سی ایسی خطا سرزد ہوگئی تھی کہ جس کی بناء پر ان سے منصب نبوت ہی جاتا رہا تھا اور یہ تو اللہ تعالیٰ پر بھی بہتان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک نبی سے رسالت سلب فرمائی اور پھر دوبارہ وہ انہیں عطا فرمادی۔جبکہ خود ہی ایک مقام پر لکھا ہے کہ نبی پیدائشی طور پر نبی ہوتا ہے۔تو جب نبی پیدائشی طور پر نبی ہوتا ہے تو دوبارہ رسالت سے نوازنے کا مطلب کیا یہ ہے کہ انہیں دُگنا رسول بنادیا جبکہ باقی انبیاء اکہرے رسول تھے۔(العیاذ باللہ)

(۶) رہنمائے اساتذہ حصہ سوئم میں سورۂ زخرف،آیت نمبر ۸۹ کا ترجمہ کیا ہے۔

آپ ﷺ ان سے درگزر کیجئے اور انہیں سلام کہیئے۔

یہ ترجمہ بھی قابل غور ہے! اس سے ظاہر ہوتا ہے انہیں محبت سے سلام کہئے یعنی یہ سلامِ محبت (تحیة) ہے۔حالانکہ یہاں سلامِ اِعراض مراد ہے جسے سلام متارکہ بھی کہتے ہیں یعنی آپ ان سے درگزر فرمائیں اور فرمادیں (بس ہمارا) سلام۔

(۷) ''عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا o اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ'' (سورۂ جن آیت نمبر ۲۶،۲۷، مطالعہ قرآن حکیم جلد نمبر ۳،ص ۱۷۸،)''(اللہ) کل غیب کا جاننے والا ہے پس وہ آگاہ نہیں فرماتا اپنے غیب پر کسی کو سوائے اس کے کہ (اللہ) کسی رسول کو (غیب کی بات بتانے کیلئے) پسند فرمائے''

توجہ طلب بات یہ ہے کہ یہاں ترجمہ میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ غیب کسی کسی رسول کو بتاتا ہے تبھی تو ''علم وعمل کی باتیں'' عنوان میں بھی وضاحت کرتے ہوئے نمبر ۱۰ میں لکھا۔''غیب کا کل علم صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے پاس ہے وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے غیب کی کچھ خبریں بتا دیتا ہے'' (مطالعہ قرآن حکیم حصہ سوئم،ص ۱۸۹) یہاں یہ کہنا کہ غیب کی کچھ خبریں بتا دیتا ہے کس لفظ کا مفہوم ہے جبکہ آیت کریمہ میں تو مطلقاً ''عَلٰى غَيْبِهٖ'' آیا ہے نہ کہ ''علی بعض غیبه'' جس کا مطلب ہو کچھ غیب۔

مزید برآں آیت کریمہ میں لفظ ''مِنْ ،مَنْ'' کا بیان ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے تمام رسول نہ کہ کچھ رسول،یعنی اللہ تعالیٰ تمام رسولوں کو غیب بتاتا ہے اس لئے اس کا صحیح ترجمہ اس طرح ہوگا ''غیب کا جاننے والا (اللہ) پس وہ آگاہ نہیں فرماتا اپنے غیب پر کسی کو مگر جنہیں اس نے پسند فرمالیا جو اس کے (سب) رسول ہیں''۔

مطالعہ قرآن حکیم میں ''اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ'' کا یوں جو ترجمہ کیا گیا ''سوائے اس کے کہ (اللہ) کسی رسول کو

(غیب کی بات بتانے کیلئے) پسند فرمائے' اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ رسولوں کو پسند نہیں فرمایا کہ ان کو غیب بتائے۔ اگر رسول غیب ہی نہ جانتا ہوگا تو منصب رسالت کو کیسے نبھا سکے گا جبکہ نبی کہتے ہی غیب کے جاننے والے کو ہیں۔

رہنمائے اساتذہ، حصہ سوئم، صفحہ ۲۷۱ پر آیت بہ آیت تشریحی نکات کے ضمن میں ان آیات کے تحت لکھا۔

کل غیب کا علم کس کے پاس ہے؟ جواب لکھا: صرف اللہ کے پاس غیب کا علم ہے۔ پھر آگے لکھا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ غیب کی خبروں سے کیسے آگاہ فرماتا ہے؟ جواب: عام قاعدہ یہ ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ غیب کی خبروں سے کسی کو آگاہ نہیں فرماتا۔ آگے لکھا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسے غیب کی خبریں عطا فرماتا ہے؟ جواب: اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے غیب کی خبریں عطا فرماتا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان آیات کی مندرجہ بالا تشریح میں غیب کی خبریں کس لفظ سے مفہوم ہے؟ کیونکہ ان آیات میں تو کوئی لفظ ایسا نہیں جس کا معنی غیب کی خبریں ہوں۔ واضح رہے کہ ایک مکتبِ فکر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے علمِ غیب تسلیم نہیں کرتا جبکہ وہ خبرِ غیب کا قائل ہے اور یہ ایک علمی اختلاف ہے۔ نصاب کی یہ عبارت دراصل اسی خاص مکتبِ فکر کی ترجمانی کر رہی ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر من مانی تشریح کی مثال ہوسکتی ہے؟

(۸) سورۂ عبس آیت نمبرا "عَبَسَ وَتَوَلّٰى" کا ترجمہ کیا ہے: "منہ بنایا اور رخ پھیر لیا"

کیا یہ ترجمہ ناموس رسالت کے تقاضوں کا محافظ ہے۔ عام انسان اپنے ماں باپ کیلئے بھی یہ کہنا پسند نہیں کرتا کہ میرے باپ نے منہ بنایا جبکہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے یہ الفاظ استعمال کئے گئے۔ کیا یہ گستاخانہ ترجمہ نہیں؟

اگر بالاستیعاب صرف ترجمہ ہی دیکھا جائے تو نہ جانے ایسے کتنے مقامات ہوں گے جو مترجم کی بے توجہی اور کم علمی پر ماتم کناں ہوں گے۔

مزید یہ کہ دعویٰ تو یہ کیا گیا ہے کہ اس نصاب کو مرتب کرنے میں خصوصی طور پر اہتمام کیا گیا ہے کہ مسلکی اختلافات سے گریز کیا جائے اور انہی امور اور تشریحات کو بیان کیا جائے جن پر عموماً سب کا اتفاق پایا جاتا ہے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر مشہور اختلافی مسائل کو ایک مخصوص مکتب فکر کے مطابق زور دے کر بیان کیا گیا ہے مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا مسئلہ کہ آپ کے والد کا نام کیا ہے؟ اور یہ کہ قرآن مجید میں مذکور آزر آپ کا چچا تھا یا والد؟ جسے لفظ "اَبٌ" سے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ لفظ "اَبٌ" والد اور چچا دونوں کیلئے کلام عرب میں آتا ہے جبکہ اس نصاب میں حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں مذکور لفظ "اَبٌ" کا اکثر جگہ ترجمہ والد کیا گیا ہے اور بت گر، آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد ثابت کیا گیا ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ بار بار یہ لفظ دہرایا گیا ہے۔ قصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں آزر کے لئے لفظِ والد ۱۲ مرتبہ استعمال کیا گیا۔

اگر چہ رہنمائے اساتذہ میں جوابدہی سے بچنے کیلئے صرف آدھی سطر میں اتنا لکھا کہ "بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ آزر آپ کا

چچا تھا'' حالانکہ مقصود تو طلباء کو تعلیم دینا ہے۔اس لیے اسکا ذکر تو طلباء وطالبات کے نصاب میں ہونا چاہیے تھا مگر معاملہ اسکے برعکس کیا کہ طلباء وطالبات کے نصاب میں آزر کو ۱۲ مرتبہ والد کہا گیا ہے۔

واضح رہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزر کی استغفار سے منع کر دیا گیا تھا۔جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۱۱۳ سے واضح ہے۔اور آپ علیہ السلام نے اُس سے برأت اور علیحدگی بھی اختیار فرمالی تھی۔جیسا کہ سورۂ توبہ آیت نمبر ۱۱۴ میں ہے۔

ترجمہ: ''پھر جب ان (ابراہیم علیہ السلام) پر ظاہر ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گئے''۔

جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والدین کی مغفرت کیلئے جو دعا کی تھی وہ قرآن مجید کی سورۂ ابراہیم آیت نمبر ۴۱

''رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَاب'' میں مذکور ہے۔

ترجمہ: ''اے ہمارے رب مجھے اور میرے والدین کو بخش دے اور سب ایمان والوں کو جس دن حساب قائم ہوگا''

لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام جو کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدامجد (دادا) ہیں، کا آزر کو والد ثابت کرنا ایک اہم اختلاف کو ہوا دینا ہے اور گویا نئی نسل کو یہ باور کرانا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نسب بھی کفر وشرک کی نجاست سے محفوظ نہیں جبکہ کئی مفسرین ومحدثین اور علماء انساب نے تصریح کی ہے کہ آزر آپ کا چچا تھا والد نہیں اور یہاں پر چچا ہی مراد ہوسکتا ہے نہ کہ والد۔کیونکہ والدین کے لئے دعا کرنے کا ذکر مذکورہ دعا میں ہے۔

مزید برآں! ابوالانبیاء، جَدُّ الانبیاء حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والدین کے حق میں یہ وہ مقبول دعا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان فرمایا اور اکثر مسلمان اِسے اپنے اور اپنے والدین کی مغفرت کیلئے نماز میں بھی پڑھتے ہیں۔اگر یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے والد کے حق میں ہی قبول نہیں ہوئی تو غیر مستجاب کلماتِ دُعا سے دعا کرنے والوں کا حال کیا ہوگا۔ (العیاذ باللہ)

مزید غور فرمائیے اس آیت کے تحت ''علم وعمل کی باتیں'' کے عنوان میں یہ لکھا

''نیک شخص اپنی اولاد کو بھی نیک دیکھنا چاہتا ہے۔وہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی مغفرت کیلئے فکر مند رہتا ہے''

(مطالعۂ قرآنِ حکیم حصہ پنجم، ص ۱۳۴)

کیا قرآنی آیت کا یہی مفہوم ہے؟ کیا ابراہیم علیہ السلام کو اپنی مغفرت کا یقین نہیں تھا؟ اگر اس آیت کی روشنی میں بچوں کو یہ بات بتائی جاتی کہ اپنے لئے، اپنے والدین کیلئے اور تمام مومنوں کیلئے دعا مغفرت کرنا سنت انبیاء اور تعلیمِ قرآن ہے تو کتنا اچھا ہوتا۔

بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اس نصاب کے ذریعے ہماری نوجوان نسل کو مطالعہ قرآن کے نام پر روح قرآن یعنی تعظیم و توقیرِ انبیاء سے دور کیا جارہا ہے تو غلط نہیں ہوگا کیونکہ بات اس انداز سے کی جاتی ہے کہ کہیں کسی کے دل میں عظمت انبیاء جاگزیں نہ ہو جائے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گرویدہ نہ ہوجائے جیسا کہ رہنمائے اساتذہ جلد نمبر ۳ صفحہ نمبر ۱۷۱، میں حدیث شریف کا وہ حصہ نکال

دیا گیا جس میں محبت رسول کا واضح بیان ہے۔

ملاحظہ ہو! رہنمائے اساتذہ نمبر۳، سورۂ جن آیت نمبر ۲۵، کے تحت لکھا۔

قیامت کے وقت کا اصل علم کس کو ہے؟ جواب: صرف اللہ کو۔

اس کے آگے عملی پہلو میں لکھا ہے۔ ہم سب کو کوشش کرنی چاہئے کہ قیامت کا دن جاننے سے زیادہ اس کی تیاری کی فکر کریں۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کب آئے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وہ آئے گی ضرور مگر یہ بتاؤ کہ تم نے اس کے لئے کیا تیاری کر رکھی ہے؟ (صحیح مسلم) (رہنمائے اساتذہ، حصہ سوئم صفحہ ۱۷۲)

اس بات کا کسے انکار ہے کہ ہمیں قیامت کی تیاری کرنی چاہئے مگر اس سلسلہ میں جو حدیث شریف نقل کی گئی اس کا اگلا حصہ اس لئے نہیں لکھا کہ اس کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا ذکر تھا کیونکہ اس سائل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوال کے جواب میں یہ بات کہی کہ میں نے قیامت کیلئے نماز، روزہ اور صدقہ وخیرات کی کثرت سے تو کوئی تیاری نہیں کی لیکن میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرتا ہوں۔ تو آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ" کہ آپ اس کے ساتھ ہوں گے جس سے آپ نے محبت کی ہے۔ (صحیح بخاری۔ رقم الحدیث ۳۶۸۸)

یہاں اس بات کا تو بالکل خیال ہی نہیں رکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مابین مکالمہ مکمل بھی ہوا ہے کہ نہیں۔ بلکہ اپنے مطلب کی حد تک صرف سوال درج کر دیا اور جواب جس میں عظمتِ رسول اور محبتِ رسول کی بات تھی وہ حصہ حذف کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ بات شاید اس نصاب کے مرتبین کے مزاج کے خلاف تھی۔

کاش یہ حدیث شریف مکمل نقل کرتے اور اس کی وضاحت کیلئے اس پر یہ سوال قائم کرتے کہ اس صحابی نے قیامت کی کس طرح اور کیا تیاری کی تھی۔ تو کیا اچھا ہوتا۔

سورۂ فرقان کی آیت نمبر ۲۷: "وَ یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْهِ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا"

"اور جس دن ظالم (افسوس سے) اپنے ہاتھ کاٹے گا وہ کہے گا کہ کاش میں نے رسول کے ساتھ ہی راستہ اختیار کیا ہوتا"

عنوان "علم وعمل کی باتیں" میں اس آیت کے تحت لکھا۔ قیامت کے دن ظالم لوگ حسرت کریں گے کہ کاش! انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راستہ اختیار کیا ہوتا۔ (مطالعہ قرآن حکیم حصہ چہارم، صفحہ نمبر ۸۳)

واضح رہے کہ آیت کریمہ میں "اِتَّخَذْتُ سَبِیْلَ الرَّسُوْلِ" نہیں آیا کہ جس کا مفہوم یہ ہوتا "میں نے رسول کا راستہ اختیار کیا ہوتا" بلکہ آیت کریمہ میں "اِتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا" آیا ہے کہ میں نے رسول کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا یعنی رسول کے ساتھ تعلق بنایا ہوتا دیکھئے آیت کریمہ کا ترجمہ تو درست کر دیا گیا مگر اس کی تشریح میں مفہوم بدل کر رکھ دیا۔

کاش! اس کی صحیح تشریح کرتے ہوئے لکھا ہوتا۔

''قیامت کے دن ظالم لوگ حسرت سے کہیں گے کاش! ہم نے رسول اللہ ﷺ کی تعظیم وتوقیر کی ہوتی اور آپ ﷺ کے ساتھ کوئی تعلق جوڑا ہوتا۔ یہ مفہوم آیتِ قرآنی کے عین مطابق ہے۔

مزید یہاں اس حوالے سے بھی کوئی سوال قائم نہیں کیا گیا کہ اس کا مخاطبِ اول کون شخص ہے اور اس نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں کونسی ایسی گستاخی کی تھی جس کی بناء پر اس کو اتنی بڑی سزا سنائی گئی اور اس گستاخ کا اتنا بھیانک انجام بیان کیا گیا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عظمت وشان جو کہ قرآن مجید سے صراحتاً ثابت ہے اس ہی کو توحید باری تعالیٰ کے ساتھ ساتھ کم از کم خوب واضح کر کے بیان کر دیا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ''علم وعمل کی باتیں'' کے عنوان میں اور باتیں تو آ گئی ہیں اور ان پر سوالات بھی خوب کئے گئے ہیں جبکہ انبیاء کرام کی عظمت وشان پر خاص توجہ نہیں دی گئی جیسا کہ سورۂ یوسف میں عظمتِ انبیاء سے متعلق بہت سے امور ہیں جنہیں ترک کر دیا گیا۔ سرِ دست یہ تین باتیں پیشِ خدمت ہیں۔

(۱) آیت نمبر ۶۸ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی جو شانِ علم بیان فرمائی کہ ''اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ'' یقیناً وہ علم والے تھے کیونکہ ہم نے ان کو علم عطا فرمایا تھا۔

بچوں کے نصاب میں اس حوالے سے کوئی بات نہیں لکھی گئی۔ کہ اس سورۃ میں کس نبی علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم عطا فرمانے سے وہ صاحب علم ہیں۔

(۲) اسی طرح آیت نمبر ۸۶ کے پہلے حصہ کے مفہوم کو یہ کہہ کر بیان کر دیا گیا کہ ''ہمیں اپنی پریشانیاں اور غم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی کے سامنے بیان کرنے چاہئیں''۔ مگر دوسرا حصہ جو عظمتِ نبی سے متعلق تھا کہ ''وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ'' اور میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اس کا کہیں کوئی ذکر تک نہ کیا۔ کاش اس آیت کے تحت یہ سوال درج کر دیا جاتا۔ کہ وہ کونسے نبی تھے جنہوں نے فرمایا ''میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔

(۳) اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے کُرتے کے متعلق جو کچھ رہنمائے اساتذہ میں لکھا اس حوالے سے بچوں کے نصاب میں کوئی بات بیان نہیں کی گئی۔ اور ہر استاد کی فکر ایک جیسی نہیں ہوتی۔ لہٰذا استاد تو اپنی فکر کے مطابق ترجمانی کرے گا جبکہ اصل مقصود تو بچوں کی تعلیم وتربیت ہے۔ کاش وہی باتیں طلباء کے نصاب ''مطالعہ قرآن حکیم، برائے طلباء وطالبات'' میں درج کی ہوتیں تاکہ طالب علم انہیں ذہن نشین کر لیتا۔

رہنمائے اساتذہ حصہ چہارم، صفحہ ۴۲ پر آیت بہ آیت تشریحی نکات میں سورۂ یوسف آیت نمبر ۱۰۶ ''وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ'' ''اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس حالت میں کہ وہ شرک کرتے ہیں'' کے تحت ایک سوال لکھا۔ کیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر ایمان لانے والوں کی اکثریت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ شرک کرتی ہے؟ جواب میں لکھا، جی ہاں۔

بڑی حیرت ہے کہ یہاں بات دراصل ان مشرکین کی ہو رہی ہے جو شرک کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ذات کا انکار نہیں کرتے

تھے۔جیسا کہ قرآن کریم میں کئی مقامات پر اس کی تصریح ہے مثلاً ''وَلَئِنْ سَاَلْتَھُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰہُ'' اور اگر آپ ان مشرکین سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے بنایا۔تو وہ ضرور کہیں گے ''اللہ'' نے جبکہ آیت کریمہ ''وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ '' کو اہل ایمان پر چسپاں کر کے لکھ دیا کیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر ایمان لانے والوں کی اکثریت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ شرک کرتی ہے؟ جواب میں لکھا، جی ہاں ۔یعنی مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کے باوجود اہل ایمان کی اکثریت اللہ کے ساتھ شرک کرتی ہے۔اگر مسلمانوں کی اکثریت مشرک ہے تو بتایا جائے کہ اُس دور میں کون سے مسلمان تھے جو اللہ پر بھی ایمان رکھتے تھے اور شرک بھی کرتے تھے اور اصل سچے مسلمانوں کی شناخت کرائی جائے کہ یہ صحیح مسلمان ہیں اور یہ مشرک مسلمان ہیں۔الغرض جیسا کہ آج کل ہر مسلمان کو مشرک قرار دیا جا رہا ہے اس کا اظہار یہاں بھی کر دیا گیا۔

مطالعہ قرآن حکیم حصہ چہارم، ص ۲۱۶،سورۃ ''ص'' کے تعارف میں لکھا ہے۔۔۔

اس سورت میں نازک مضامین یعنی بعض انبیاء کرام علیہم السلام کی خطاؤں کا بیان کیا گیا ہے۔

بڑی حیران کن بات یہ ہے کہ بچوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے خطائیں ہوئیں۔سوال یہ ہے کہ اس سورت میں جتنے انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر آیا ان کے کس عمل کو قرآن پاک یا حدیث شریف میں خطا قرار دیا گیا ہے؟ انبیاء کرام علیہم السلام کی یہ کردار کشی نہیں تو اور کیا ہے؟

ہاں سورۃ ص کی آیات ''وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰہُ'' اور ''وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ ۔۔۔۔الآیۃ'' سے انبیاء کرام علیہم السلام کی خطائیں تو نظر آ گئیں جسے قرآن حکیم نے خطا نہیں بلکہ آزمائش وامتحان کہا۔رہا یہاں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا استغفار اور طلب بخشش کرنا یہ کسی خطا کی بنا پر نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے انکی جو آزمائش فرمائی تھی اس پر پورا اترنے کیلئے اظہارِ عاجزی اور انکسار کرتے ہوئے انہوں نے یہ دعا کی تھی مگر افسوس کہ اسی سورت میں ''فَسَخَّرْنَا لَہُ الرِّیْحَ تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖ رُخَآءً... اور اُرْکُضْ بِرِجْلِکَ '' آیات نظر نہیں آئیں جن سے واضح ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ معجزات کو انبیاء کرام علیہم السلام کے اختیار میں دے دیتا ہے جیسا کہ ہوا، جو کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کے حکم کی بناء پر جہاں وہ چاہتے تھے چلتی تھی اور حضرت ایوب علیہ السلام کو حکم ہوا کہ ''زمین پر اپنا پاؤں مارو'' اور اس سے چشمۂ شفاء جاری ہو گیا۔

مزید المیہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام کے ان عظیم الشان معجزات کے بارے میں ''علم وعمل کی باتیں'' اور ''ہم نے کیا سمجھا'' کے عنوانات کے تحت بچوں سے کوئی تذکرہ نہیں ہے۔کہ کہیں ایک معصوم بچے کے دل ودماغ میں عظمت انبیاء کی کوئی کرن نمودار نہ ہو جائے۔بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات کو ایسے پیرائے میں پیش کیا گیا کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے پردے میں انبیاء کرام علیہم السلام کو معطل اور انکی چھٹی کرا دی گئی ہو گویا کہ ان معجزات سے انکا کوئی تعلق ہی نہیں بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے معجزات ہیں حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا شاہکار اور انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات ہوتے ہیں۔

ہاں مرتبین نصاب نے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے کیلئے اس کا تذکرہ انتہائی مختصر انداز میں سورۂ نمل میں کر دیا جبکہ یہ آیات تو سورۂ ص کی ہیں۔ الغرض یہ کہ شان انبیاء واولیاء کے بیان کرنے میں جتنا بخل اور ہیرا پھیری کر سکتے تھے اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کا ذکر کر کے یہ سوال تو قائم کیا کہ ''کس نبی علیہ السلام نے بیماری میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو پکارا تو اللہ تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ نے ایک میٹھے پانی کے چشمے کے ذریعے انہیں صحت عطا فرمائی'' (مطالعہ قرآن حکیم، حصہ چہارم صفحہ ۲۲۸) مگر اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ وہ چشمہ کیسے نمودار ہوا کہ کہیں بچوں کے قلوب واذہان میں عظمتِ انبیاء علیہم السلام جاگزیں و مستحکم نہ ہو جائے۔

کاش! وہاں ایک سوال یہ بھی ہو جاتا کہ وہ کون سے نبی ہیں جن کی ٹھوکر میں اللہ تعالیٰ نے ایسی برکت رکھ دی تھی کہ جس سے چشمۂ شفاء جاری ہو گیا۔ بلکہ ہونا تو یوں چاہئے تھا کہ اس نصاب میں حسب موقع انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات تفصیل سے بیان کئے جاتے تو یہ چیز بچوں کی کیلئے زیادہ دلچسپی کا باعث ہوتی اور وہ مزید ذوق وشوق سے اس نصاب کو پڑھتے۔

رہنمائے اساتذہ حصہ اول، صفحہ ۳۸ پر انبیاء کرام سے خطائیں واقع ہونے کے اس مفہوم کو مزید واضح کرنے کے لیے لکھا۔

''حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام نے خطا کرنے کے بعد کیا کیا؟''۔

جواب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور توبہ کی''۔

مندرجہ بالا حوالہ جات کی روشنی میں کیا ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب نہیں ہوں گے کہ حضرت آدم اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی ایسی دعائیں جو کسر نفسی اور عجز وفروتنی یا ان سے جو بھول ہوئی اس پر مبنی ہیں انہیں اس دوسرے انداز سے پیش کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ دیکھو حضرات انبیاء کرام سے کتنی بڑی خطائیں ہوئیں کہ وہ توبہ واستغفار کرتے رہے۔ کاش جہاں آدم علیہ السلام کے توبہ و استغفار کی بات کی وہاں آپ کے خلیفۃ اللہ ہونے اور دست قدرت سے تخلیق فرمائے جانے کی عظمت ورفعت کو بھی بیان کیا جاتا تا کہ طالب علم کے ذہن میں کوئی ابہام نہ رہ جاتا۔ اور وہ جان لیتا کہ

جن کے رُتبے ہیں سِوا، اُن کی سِوا مشکل ہے

اصل خرابی یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی استغفار کو ان کے خطا کار ہونے پر محمول کیا گیا ہے اور ان کی استغفار کی کوئی صحیح توجیہ پیش نہیں کی گئی۔

سورۂ نجم کی آیت ''عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی'' جس کی تفسیر میں اختلاف ہے اس کی تشریح میں تو حضرت جبرائیل علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معلم ثابت کیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کا شاگرد۔ اور سوال یوں قائم کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کس نے تعلیم دی؟

اس کے جواب میں لکھا ''اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے''۔ (رہنمائے اساتذہ حصہ سوئم، صفحہ ۱۳۴)

جبکہ اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے ''اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ o عَلَّمَهُ الْبَيَانَ o''

رحمٰن نے (رسول کوکُل علم والا یہ) قرآن تعلیم فرمایا (اپنے محبوب رسول، کامل) انسان کو پیدا کیا۔انہیں (علوم قرآن کا) بیان سکھایا۔

جب یہاں یہ صراحت ہے کہ رحمٰن نے یہ قرآن خود تعلیم فرمایا اور اجلّہ مفسرین نے یہاں انسان سے مراد رسول اللہ ﷺ لئے ہیں۔سورۂ قیامہ اور سورۂ الاعلیٰ میں بھی مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو قرآن سکھایا۔مگر ان امور کو خاطر میں نہیں لائے کہ کہیں عظمتِ مصطفی ﷺ طلباء کے دلوں میں اجاگر نہ ہو جائے کہ ہمارے رسول تو وہ ہیں جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے پڑھایا، سکھایا ہے۔جب اس نصاب کے مرتبین نے خود لکھا بھی ہے کہ ہم نے دس معتبر تفاسیر کی روشنی میں اسے مرتب کیا ہے تو کیا انہیں ان تفاسیر میں کہیں بھی ایسی بات نہیں ملی جس سے اللہ تعالیٰ کا اپنے حبیب ﷺ کو تعلیم دینا واضح ہوتا ہو اور ''عَلَّمَهُ شَدِيْدُ الْقُوٰى'' سے اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس مراد لی گئی ہو۔

اسی طرح آیت بہ آیت تشریحی نکات کے ضمن میں سورۂ نجم آیت نمبر ۹ ''فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى'' ترجمہ: پس دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا یا اس سے بھی کم۔اور آیت نمبر ۱۱ ''مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰى'' ترجمہ: دل نے اسے نہیں جھٹلایا جو کچھ انہوں نے دیکھا۔کے تحت جو گل افشانی کی ہے وہ بھی دیدۂ عبرت سے مطالعہ کرنے کے قابل ہے کہ ایک خاص فکر کی نمائندگی کرتے ہوئے ان آیات کا مصداق اللہ تعالیٰ کی بجائے محض حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ٹھہرایا۔

سورۂ قلم کی آیات (۸ تا ۱۳) میں جس انتہائی اور زوردار انداز میں شانِ نبوت میں گستاخی کرنے والے کافر کی مذمت کی گئی، اس کو ویسے نہیں بیان کیا گیا بلکہ انتہائی معمولی انداز سے یہ کہہ کر کہ ''ایمان سے محرومی انسان میں برے اخلاق پیدا کر دیتی ہے'' (مطالعہ قرآن حکیم حصہ سوئم، ص ۱۴۹) بات ختم کر دی گئی۔اس حوالے سے کوئی بات نہیں لکھی کہ اس نے کیا گستاخی کی، اور بالخصوص گستاخ رسول سے ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیئے۔جبکہ حق تو یہ بنتا تھا کہ اس گستاخ کی گستاخی کو ذکر کیا جاتا اور یوں کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کے گستاخ کو ایک کی دس سنائیں یعنی اس نے ایک گستاخی کی اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دس باتوں سے اس کی تذلیل فرمائی۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جہاں انبیاء کرام کی عظمت وتوقیر کی بات آتی ہے تو اس کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور جہاں گستاخ کی گستاخی کا بیان ہوتا ہے تو اس کو چھپا دیا جاتا ہے یَا لَلْعَجَبُ

رہنمائے اساتذہ حصہ سوئم، صفحہ ۲۶۲ پر نوٹ لکھا۔اس سورت میں نوح علیہ السلام کا قصہ محض قصہ گوئی کی خاطر بیان نہیں کیا گیا ہے بلکہ مقصود اس سے رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کی قوم کے سامنے ایک ایسا آئینہ رکھ دینا ہے جس میں آپ ﷺ بھی دیکھ لیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول کو اپنی آخری منزل تک پہنچنے کے لئے صبر وانتظار کے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔۔۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ ہمارے عرف عام میں کسی کے سامنے آئینہ رکھ دینے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔مندرجہ بالا عبارت کو غور سے پڑھیئے اور خود نتیجہ اخذ کیجئے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے آئینہ رکھ دینے کا مطلب کیا ہے؟۔کیا ناموس رسالت کا یہی تقدس ہے۔کیا یہ گستاخی نہیں؟

رہنمائے اساتذہ حصہ سوئم صفحہ ۲۷۰ ، پر سوال لکھا۔کل اختیار صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اس بات کو کیسے واضح کیا گیا؟

جواب لکھا۔آپ سے اعلان کروایا گیا کہ بیشک میں اختیار نہیں رکھتا تمہارے لئے نقصان کا اور نہ بھلائی کا۔

آگے جواب کے ساتھ نوٹ لکھا: نفع ونقصان کا اختیار صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاتھ میں ہے انبیاء کرام علیہم السلام بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم کے پابند ہوتے ہیں اور جو کچھ کہتے یا کرتے ہیں وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم کے مطابق ہی ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۸۸ میں فرمایا گیا کہ''آپ فرما دیجئے کہ میں اپنی ذات کے لئے کسی نفع اور نقصان کا خود مالک نہیں ہوں مگر (یہ کہ) جس قدر اللہ چاہے''

اس بارے میں اتنا عرض ہے کہ فرمان الٰہی ''لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ''(اُسی (جان) کے فائدے کے لئے ہے جو اس نے (نیک کام) کیا۔اور اسی پر ضرر ہے اس کا، جو اس نے (بُرا کام) کیا) کی روشنی میں مذکورہ بالا آیت کریمہ کا مفہوم متعین کیا جاتا تاکہ قرآنی آیات کا آپس میں ٹکرانے کا احتمال ختم ہو جاتا۔اور آیت کریمہ ''لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا'' (اگر وہ (قرآن) اللہ کے غیر کی طرف سے ہوتا تو وہ ضرور اس میں اختلاف پاتے۔) کی وضاحت ہو جاتی کہ یہاں بھی آیات میں کسی قسم کا تعارض اور ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ ان کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ہر شخص اپنی بھلائی اور برائی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے ہر عمل کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے تو میں بھی تمہارے نفع وضرر کا اس طرح مالک ہوں کہ میرے فعل کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے جبکہ میں اپنے فعل کا کاسب ہوں اور اسی تخلیقِ فعل اور کسبِ فعل کو آیت مذکورہ میں ''اِلا ماشاء الله'' کے کلمات میں بیان فرمادیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فعل کو پیدا فرماتا ہے اور آپ ﷺ وہ کام کر لیتے ہیں جبکہ یہاں تو یہ تاثر ملتا ہے کہ حضور ﷺ نے امت کی بھلائی کیلئے جتنے بھی کام کئے ہیں ان میں آپ ﷺ بے اختیار تھے۔

اسی طرح رہنمائے اساتذہ حصہ اول ص ۲۸ پر یہ حدیث شریف نقل کی کہ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جوتے کا تسمہ بھی مانگنا ہو تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے مانگو'' (ترمذی شریف)

دی علم فاؤنڈیشن کے مرتب کردہ نصاب مطالعہ قرآن حکیم برائے طلباء و طالبات اور رہنمائے اساتذہ مطالعہ قرآن حکیم برائے طلباء وطالبات میں کئی مقامات پر اس حدیث شریف کی روشنی میں یہ بات بار بار تحریر کی گئی ہے کہ ہمیں جو کچھ بھی مانگنا ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی سے مانگنا ہے (اگرچہ جوتے کا تسمہ ہی کیوں نہ ہو)۔

رسول اللہ ﷺ کے فرمان سے تو کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا مگر ہمارا اختلاف اس حدیث پاک کی تشریح میں اُس اندازِ تحریر سے ہے جس میں انبیاء کرام علیہم السلام و اولیاء عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی قِلّتِ ادب ہے کیونکہ اسلام ایک حسین مذہب ہے اور اس کو عقلِ سلیم کے تقاضوں کے مطابق بیان کرنا چاہئے۔انصاف سے فیصلہ کیا جائے کہ جب کسی کو وسیلہ نہ مانتے ہوئے یہ جملہ کسی

عقلِ سلیم رکھنے والے شخص کے سامنے بیان کیا جائے، کیا وہ اسلام کو دین فطرت اور ایک سچا مذہب سمجھے گا۔ کیا اس کے ذہن میں یہ خیال نہیں آئے گا کہ ساری زندگی تو دوکانوں سے جوتے کے تسمے، نمک وغیرہ خریدتے رہے اور زبان سے یہ کہتے ہیں۔ کہ ہم سب کچھ اللہ سے مانگتے ہیں خواہ وہ جوتے کا تسمہ ہی کیوں نہ ہو۔ کیا یہ سارے دوکاندار، ان کے الہٰ اور معبود ہیں؟ یہ مسلمانوں کے قول وفعل میں کیسا تضاد ہے۔

ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ کم ازکم اسلام کو ایسے اندازِ بیان سے بچائیں جو اس کی حقانیت کے خلاف ہو۔ بلکہ ایسا اندازِ بیان اختیار کریں جس سے اس کی صداقت وحقانیت پر حرف نہ آئے۔ ظاہر ہے یہاں ذراسی وضاحت کے ساتھ یوں بات کہی جائے تو ہر قسم کا غبار دُھل جائے گا کہ ہم جس سے جو چیز بھی طلب کرتے ہیں درحقیقت وہ اللہ ہی عطا فرماتا ہے چاہے وہ جوتے کا تسمہ ہی کیوں نہ ہو بظاہر جس سے جو چیز طلب کی ہے وہ ہمارے اور اللہ کے درمیان وسیلہ ہے۔ تو اس میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں کہ عادت الٰہیہ اسی طرح ہے کہ دیتا اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر اس کی عطا کیلئے وسائل ہوتے ہیں۔

اس پوری کتاب میں وسیلے کی بجائے بکثرت ذریعے کا لفظ استعمال کیا گیا جبکہ قرآن کریم میں وسیلہ کا لفظ بارہا آیا ہے ذریعہ کا لفظ ایک بار بھی نہیں آیا ہمیں قرآنی نصاب میں قرآنی لفظ استعمال کرنا چاہئے۔

بصورت دیگر خود سوچیں جس سے ہمیں نمک اور تسمہ مل رہا ہے آپ اسے وسیلہ نہیں مانتے تو اور کیا مانیں گے کیونکہ اگر آپ نے اس کو وسیلہ نہیں مانا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ شخص حقیقتاً خود دینے والا ہے اور جو حقیقتاً دینے والا ہو وہ تو اللہ ہوتا ہے۔ وسیلے کا انکار شرک کو مٹاتا نہیں بلکہ شرک کی دعوت دیتا ہے۔ صرف یہی ایک مقام نہیں بلکہ قرآن کریم میں کئی آیات ایسی ہیں جو تشریح کے بغیر واضح نہیں ہوتیں اور علماء جب بھی بیان کرتے ہیں ساتھ ہی وضاحت کر دیتے ہیں جیسا کہ آیت ''وَمَنْ كَانَ فِىْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى'' (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۷۲) ترجمہ: اور جو شخص اس دنیا میں اندھا رہے وہ آخرت میں اندھا ہوگا۔

اگر اس آیت کو جوں کا توں رکھا جائے اور اس کی درست وضاحت نہ کی جائے تو پڑھنے والا اس کا یہی مطلب اخذ کرے گا کہ جو بیچارہ دنیا میں اندھا ہے اور اپنی آنکھوں کی روشنی سے محروم ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی اٹھے گا جبکہ یہاں مفہومِ قرآن تو یہ ہے جو دنیا میں ہدایت سے بے بہرہ ہوگا آخرت میں بھی ہدایت سے خالی ہوگا اور جہنم کا ایندھن بنے گا۔

سورۃ الضحیٰ آیت نمبر ۴ جس کا ترجمہ ہے۔ ''اور آنے والا وقت بہتر ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے پہلے گزرے وقت سے'' اس کے عنوان ''علم وعمل کی باتیں'' کے ضمن میں لکھا ہے۔ ''اللہ سبحانہ وتعالیٰ نیک لوگوں کو دنیا وآخرت میں بہترین اعزاز و انعام عطا فرماتے ہیں''۔ کیا اس آیت کا یہی مفہوم ہے؟ جبکہ اس کا مفہوم تو یہ ہے کہ ہر آنے والے لمحہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان وشوکت میں پچھلے لمحہ کی نسبت اضافہ ہو رہا ہے۔

سورۃ الضحیٰ آیت نمبر ۵ ''وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى'' ترجمہ۔ ''اور عنقریب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رب

(اتنا) عطا فرمائے گا کہ آپ ﷺ خوش ہو جائیں گے'' اس کے عنوان ''علم وعمل کی باتیں'' کے تحت نمبر ۵ کے آگے لکھا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ قیامت کے دن آپ ﷺ کو بہت بلند مرتبہ اور مقام عطا فرمائیں گے۔ (مطالعہ قرآن حکیم حصہ اول، ص ۱۶۰)

کیا اس آیت کا مفہوم صرف اتنا ہی ہے جو یہاں رسول اللہ ﷺ کی شان کو واضح کرنے کیلئے کافی ہو۔ حالانکہ مکمل سورت رسول اللہ ﷺ کی عظمت وشان میں نازل ہوئی حیرت کی بات یہ ہے اس میں صرف ایک سطر آپ ﷺ کے بارے میں لکھی گئی وہ بھی بہت معمولی انداز میں جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اس میں آیت کے اصل مفہوم کو واضح ہی نہیں کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو کیا کچھ عطا فرما کر کس کس طریقہ سے آپ ﷺ کے مقام محبوبیت کو اجاگر کرتے ہوئے آپ ﷺ کو راضی فرمائے گا۔

اسی طرح سورۂ لہب، ابولہب کی اس گستاخی پر نازل ہوئی جو اس نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں کی بڑی حسرت ہے اس انداز فکر پر کہ اس سورۃ کی تشریح میں رہنمائے اساتذہ برائے قرآن حکیم حصہ اول ص: ۱۴۴ پر ابولہب اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تین طرح کی تعلق داری کو بیان کرنے کے بعد جو نتیجہ نکالا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ ابولہب نے کسی تعلق کی پرواہ نہیں کی لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعلق اور رشتہ داری کا اسے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس لئے مطالعہ قرآن حکیم حصہ اول، ص ۱۳۲، پر علم وعمل کی باتیں عنوان میں لکھا۔

نیک انسان سے رشتہ داری نیک اعمال کی کمی کو پورا نہیں کر سکتی۔

یہاں ابولہب کی رشتہ داری نیک انسان یعنی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھی اور آگے یہ جو لکھا ہے کہ نیک اعمال کی کمی کو پورا نہیں کر سکتی، یہ بتایا جائے کہ ابولہب نے کونسا ایسا نیک عمل کیا تھا کہ جس میں کمی رہ گئی تھی اور رشتہ داری نے اسے پورا نہ کیا۔ کیا اس نے جو یہ گستاخی کی تھی یہ نیک عمل تھا اور اس میں کوئی کمی رہ گئی تھی جو پوری نہ ہوئی (العیاذ باللہ) ملاحظہ کیا جائے کہ یہ جملہ کسی مشرک کے متعلق لکھنا ہمیں زیب دیتا ہے۔ اس انداز بیان سے طلباء کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے گی کہ انبیاء کرام علیہم السلام واولیاء عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مسلمان رشتے داروں کے احترام کی کوئی حیثیت نہیں ہے بالخصوص سادات کرام کا احترام بھی ان کے دلوں سے جاتا رہے گا۔ اسی فکر کو قصہ حضرت نوح علیہ السلام اور قصہ حضرت لوط علیہ السلام میں بھی دوہرایا گیا ہے۔ جس کا بیان ابھی آگے آ رہا ہے حالانکہ جو بات قابل بیان تھی اسے ذکر نہیں کیا کہ اس سورۃ میں تو یہ پیغام عبرت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے رشتہ داری کے باوجود بے ادبی اور گستاخی کی بنا پر ابولہب اور اس کی بیوی کو جہنم کا ایندھن بنا دیا گیا اور رہتی دنیا تک ہر بے ادب اور گستاخِ رسول کیلئے یہ مثال قائم کر دی کہ اگر کسی سے بھی جب کبھی کوئی ایسا لفظ یا فعل صادر ہوا جس سے رسول اللہ ﷺ کی شان میں بے ادبی کا کوئی پہلو نکلے تو اس کا انجام بھی یہی ہوگا کہ غضب الٰہی کی آگ اسے جلا کر رکھ دیگی کیونکہ بات صرف نیک انسان سے رشتہ داری کی نہیں بلکہ اللہ کے رسول ﷺ کی بے ادبی اور گستاخی کی ہے جیسا کہ اس سورۂ مبارکہ کا پہلا جملہ ہی اس گستاخی کا جواب ہے جو اس نے کہا تھا ''تَبًّا لَّکَ'' (معاذ اللہ)۔ کاش یہاں یہ سوال بھی قائم کیا ہوتا۔

(ا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت وناموس کا تحفظ سب سے پہلے کس نے کیا؟

جواب: (الف) اللہ تعالیٰ نے (ب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (ج) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے

جبکہ یہاں اس نصاب میں بات اس انداز سے کی جارہی ہے کہ مسلمان ہو یا کافر جو بھی بُرے اعمال کرنے والا ہے اسے کسی بھی نیک انسان کی رشتہ داری فائدہ نہیں دیتی اور اسی طرح سورۂ کہف آیت نمبر ۸۲ میں بھی جو بات بیان کرنے کی تھی اسے بیان نہیں کیا کہ جب حضرت خضر علیہ السلام نے بستی والوں کی دیوار سیدھی کرنے کی یہ حکمت بیان کی کہ اس دیوار کے نیچے دو ایسے یتیموں کا خزانہ دفن تھا جن کا باپ نیک تھا۔ اس کے تحت ''علم وعمل کی باتیں'' کے عنوان میں بچوں کو یہ سبق نہیں دیا گیا کہ نیک انسان کی رشتہ داری مسلمانوں کو فائدہ دیتی ہے اور نیک ماں باپ کی نیکیوں کا ثمر اولاد کو بھی ملتا ہے۔

رہنمائے اساتذہ حصہ اول، ص ۱۴۴، پر خاص پیرائے میں بین السطور اپنا یہ موقف بھی واضح کردیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین اگر مومن نہ بھی ہوں تو کوئی بڑی بات نہیں لہٰذا یوں لکھا ''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابولہب چچا تھے ہر معاشرے میں اور عربوں کے ہاں بھی چچا والد کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے''۔ (ایسی بات کے لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟)

مطالعہ قرآن حکیم حصہ اول ص ۴۰، پر حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ سے متعلق علم وعمل کی باتیں کے عنوان نمبر ۹ میں لکھا۔

بُرے اعمال کرنے والوں کو کسی نیک شخص کی رشتہ داری یا تعلق اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔

یہاں بھی انبیاء کرام کے وہ رشتہ دار اور تعلق دار مراد ہیں جو کافر ومشرک تھے لیکن انہیں یہاں صرف بُرے لوگ کہہ کر مخاطب کیا گیا اور ان کے کفر وشرک کو بُرے اعمال سے تعبیر کیا گیا حالانکہ یہاں اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ انہیں کافر ومشرک کہہ کر ان کی پرزور مذمت کی جاتی تاکہ یہ بات واضح ہوجاتی کہ مسلمان رشتہ دار اور تعلق رکھنے والوں کا یہاں تذکرہ نہیں۔ جبکہ یہاں ان کفار ومشرکین کو صرف بُرے اعمال والا کہہ کر یہ تاثر دیا گیا ہے کہ ہر شخص کے صرف اپنے اپنے اعمال ہیں تمہیں کسی دوسرے کے عمل سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور اسی نظریئے کو جگہ جگہ فروغ دیا گیا ہے جیسا کہ ''مطالعہ قرآن حکیم حصہ اول ص ۸۸''، قصۂ حضرت لوط علیہ السلام کے ضمن میں ''علم وعمل کی باتیں''، نمبر ۵ کے تحت لکھا۔

اگر انسان ایمان اور نیک اعمال میں پیچھے رہ جائے تو کسی نیک آدمی سے رشتہ داری اسے فائدہ نہیں دے گی۔

یہاں ایمان کا لفظ تو محض خانہ پوری کے لئے لکھا گیا ہے جبکہ بات تو نیک اعمال کی کی گئی ہے۔ اگر ایمان میں پیچھے رہ جانے کی بات ہوتی تو بُرے اعمال کے ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی جیسا کہ ہر ذی فہم یہ بات جانتا ہے کہ جب ایمان ہی نہیں ہے تو اچھے بُرے اعمال کی کیا حقیقت۔

عمومی جائزہ:

مندرجہ بالا حوالہ جات کی روشنی میں غور کیا جائے تو خود بخود واضح ہوجائے گا کہ یہ دعویٰ جو کیا گیا ہے اس کی حقیقت کیا ہے کہ

ہم نے تو مسلکی اختلافات سے بالاتر ہو کر یہ نصاب مرتب کیا ہے۔غور کریں کون سا ایسا اختلافی مسئلہ ہے جو اس میں بیان نہیں کیا گیا اور کون سا ایسا موقع ہے جہاں پر ذرا سی بھی گنجائش نظر آئی تو وہاں ناموس رسالت کے تقدس کو پامال نہ کیا گیا ہو۔

دی علم فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر صاحب کا کہنا یہ بھی ہے کہ قرآن پاک میں اگر اختلافی آیات ہیں تو وہ سو کے قریب ہیں ان کو چھوڑ کر باقی چھ ہزار آیات جن پر اتفاق ہے ان کے معنی ومفہوم سے مسلمانوں کو کیوں محروم رکھا جائے۔۔۔۔

یہ ایک نیا بہانہ ہے اس بات کا کہ ان آیات کو چھوڑ دیا جائے جن سے عظمت انبیاء کرام علیہم السلام واولیاء عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین ظاہر ہوتی ہے۔ کہ نہ ان پر تبصرہ ہوگا نہ ان حضرات کی عظمت اجاگر ہوگی اور ایسا ہی کیا گیا جیسا کہ سابقہ عبارات سے یہ بات عیاں ہو چکی ہے۔ اگر اتنا ہی ہوتا تو شاید یہ بات اتنی آگے نہ بڑھتی مگر یہاں تو عالم یہ ہے کہ وہ آیات جن سے بلاوجہ اور خواہ مخواہ لوگ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام واولیاء عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں تنقیص کا پہلو نکالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں انہیں تو اسی انداز پر خوب واضح کر کے بیان کیا گیا، ہاں بعض وہ آیات جن کو اختلافی سمجھ کر چھوڑ دیا گیا وہاں پر تو کوئی اختلافی کلام نہیں کیا لیکن دوسرے مواقع پر اپنی خاص فکر کے مطابق دل کھول کر اپنی من بھاتی تشریح کر کے بات پوری کر دی اور بالخصوص انبیاء کرام علیہم السلام کی عصمت کا ذرا بھی پاس نہیں رکھا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے جن خوبیوں اور محاسن سے ان کو نوازا تھا اس کی وضاحت کا قطعاً حق ادا نہیں کیا گیا بلکہ جگہ جگہ ان کی استغفار اور توبہ کرنے کو بیان کیا گیا ہے اور ان کی استغفار سے متعلق سوالات کو اس انداز پر بار بار بیان کیا گیا ہے کہ ایک بے چارہ نادان طالب علم خواہ مخواہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ (معاذ اللہ) انبیاء کرام نہ جانے کتنے خطا کار تھے کہ انہوں نے اس قدر استغفار کی ہے۔ جبکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے استغفار کرنے کی جو حسین اور بہترین توجیہات قرآن وحدیث کی روشنی میں علماء کرام نے پیش کی ہیں ان کا دور دور تک ذکر نہیں۔

اس نصاب میں بار ہا مرتبہ انبیاء کرام سے خطاؤں کا ہونا اور انکا توبہ کرنا نہایت واشگاف اور بے باکی سے بیان کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے جب انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں بار بار خطا اور توبہ کی رٹ لگائی جائے گی اور اس کی کوئی معقول توجیہ بھی بیان نہ کی جائے گی تو کیا ایک ناسمجھ بچہ کبھی انہیں معصوم ماننے پر تیار ہوگا؟ اور کیا وہ ان کے لائے ہوئے دین کو محفوظ عن الخطا سمجھے گا؟ بلکہ وہ تو یہی بات سمجھے گا کہ دین لانے والا جب خطا کار و گنہگار رہے کیونکہ وہ بار بار توبہ بھی کر رہا ہے، تو لازماً وہ بچہ کچھ دنوں کے بعد یہ بھی سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ ان حضرات علیہم السلام سے دین میں بھی نہ جانے کس کس مقام پر لغزش، غلطی اور خطا ہوئی ہوگی۔ اگرچہ انبیاء کرام کو گنہگار ثابت کرنے کے لئے گناہ کے لفظ کو تو ذکر نہیں کیا گیا مگر خطا کے لفظ کے ساتھ توبہ کا اضافہ کر کے بات پوری کر دی گئی ہے۔

(العیاذ باللہ)

اور وہ مسئلہ جو متفق علیہ ہے یعنی "عصمت انبیاء اور توہین رسالت" اُسے تو اس نصاب میں بالکل نہیں اٹھایا گیا حالانکہ یہ روح قرآن ہے جبکہ یہاں انداز کلام ایسا ہے جس سے ہر شخص پر یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ انبیاء کو معصوم ماننا کوئی ضروری نہیں ہے یا یوں کہہ

لیں کہ عصمت انبیاء کے خلاف اس میں ایک مہم چلائی گئی ہے جبھی تو سورۂ ص میں کہا گیا کہ ''اس سورۃ میں نازک مضامین یعنی بعض انبیاءکرام علیہم السلام کی خطاؤں کا بیان کیا گیا ہے'' تاکہ طلباء کے دل میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ انبیاءکرام علیہم السلام خطا کار انسان تھے دیکھو اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے پھر رہے ہیں۔(العیاذ باللہ) جبکہ آدم علیہ السلام کا مسجود ملائکہ ہونا قرآن مجید میں بار بار ذکر کیا گیا ہے اور یہ انکے انتہائی شرف اور بزرگی کی بات ہے کہ وہ مسجود ملائکہ تھے۔لیکن طلباء کیلئے ''علم وعمل کی باتیں'' عنوان کے تحت اسکا کوئی تذکرہ نہیں، یہ بات واضح رہے کہ اگر نبی معصوم نہیں ہے تو ایسی صورت میں دین کے ہر مسئلہ میں شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے اس ایک مسئلہ میں نبی سے خطا ہوگئی ہو۔اسی طرح دوسرے مسئلے میں، اسی طرح تیسرے مسئلہ میں علی ھذا القیاس اس طرح تو پورے دین سے ہی ایمان اٹھ جائے گا۔۔

مرتبین نصاب نے یہ لکھ تو دیا ہے کہ ہم اختلافی آیات سے اجتناب کریں گے اس کے باوجود اختلافی مسائل ایک مکتبِ فکر کے مطابق بار بار واضح کر کے بیان کئے گئے ہیں اور ایسی بہت ساری مثالیں ہیں مثلاً حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے علم غیب کا مسئلہ کہ جس میں اختلاف کیا جاتا ہے واضح طور پر بغیر کسی وضاحت کے لکھ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی علم غیب نہیں دیتا جبکہ پورے قرآن مجید میں یہ کہیں بھی نہیں آیا کہ اللہ تعالیٰ غیب کا علم کسی کو نہیں دیتا جبکہ یہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو غیب بتلاتا ہے سورۂ نمل کی آیت نمبر ۶۵ ''قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہ '' (آپ فرمادیجئے غیب نہیں جانتا جو کوئی آسمانوں اور زمینوں میں ہے اللہ کے سوا) سے یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو غیب کا علم نہیں دیتا ہے کیونکہ اس میں غیب کے خود سے جاننے کی نفی کی گئی ہے کسی کو عطا کرنے کی نفی نہیں کی گئی بلکہ غیب عطا فرمانا ثابت ہے جیسا کہ سورۂ جن آیت نمبر ۲۶، ۲۷ سورۂ یوسف آیت نمبر ۶۸ اور ۸۶ کے تحت اس پر کلام گزر چکا۔اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا مسئلہ کہ اٰزر آپ کا چچا تھا یا والد جس میں اختلاف کیا جاتا ہے۔اس اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نصاب میں اٰزر کو بڑے شدّ ومد سے والد قرار دیا گیا ہے جو کہ بت گر اور بت پرست تھا اور اس نصاب کو اس انداز میں تحریر کیا گیا ہے کہ اس کا پڑھنے والا نادان طالب علم ایک خاص فکر کی طرف رجحان رکھے گا۔

ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ انبیاء کرام کی استغفار کو اس انداز پر بیان کیا جانا چاہئے تھا کہ جس سے ان کی عصمت میں فرق نہ آئے جبکہ آدم علیہ السلام ودیگر انبیاءکرام علیہم السلام کی عصمت طیبہ کی دھجیاں اس انداز سے بکھیری گئی ہیں جو کہ آپ نے خود ملاحظہ فرمالیں ہیں پس خون کے آنسو رویئے یَا اَسَفٰی

اگر یہ کہا جائے کہ دانستہ ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ کہیں اگر یہ بات ہوئی ہے تو بھول کر ہوئی ہے تو افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ ہمیشہ ایسی ہی باتیں بھول جاتیں ہیں جو کہ عظمت انبیاء ورفعت اولیاء کے متعلق ہوتی ہیں۔

ان حضرات کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس نصاب میں فقہی مسائل سے اجتناب کیا گیا ہے گویا یوں کہہ لو کہ آپ نے ایک تہائی قرآن

کو چھوڑ دیا ہے کیونکہ قرآن مجید میں بنیادی طور پر ان تین اہم امور پر بہت زور دیا گیا ہے۔

(۱) توحید و رسالت　　(۲) قصص و امثال　　(۳) احکام

جبکہ احکام یعنی فقہی مسائل انسان کی پوری زندگی پر محیط ہوتے ہیں۔ حلال و حرام، جائز ناجائز، وغیرہ وغیرہ اگر ان سے بچا جائے گا تو ایک مسلمان اپنا رہن سہن، بود و باش کو اسلامی انداز پر کیسے ڈھال سکتا ہے۔

آج کل کے زمانے میں کوئی شخص بچہ نہیں، ہر آدمی بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ فقہی مسائل سے اجتناب کی حقیقی وجہ یہی ہے کہ اولاً ابتدائی مقصد حاصل ہو جائے یعنی لوگوں کا عقیدہ تبدیل کر دیا جائے کیونکہ آیات طلاق میں اگر تین طلاق کو ایک طلاق کہا گیا اس طرح اگر امام کے پیچھے قرات کا حکم دیا گیا اور آمین زور سے کہنے کو ثابت کیا گیا وغیرہ وغیرہ تو وطن عزیز پاکستان میں رہنے والے حنفی چیخ اٹھیں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور ان حضرات کا منصوبہ جو درحقیقت عقیدہ کو تبدیل کرنا، عشق مصطفیٰ سے دور کرنا، عصمت انبیاء کو پارہ پارہ کرنا ہے سب دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔

اب آپ خود ملاحظہ کیجئے کہ ہمارے ہاتھ میں اس نصاب کی آٹھ جلدیں ہیں ان آٹھ جلدوں میں صاحب قرآن سید المرسلین ﷺ و دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی عزت و عظمت طلباء کے دلوں میں اجاگر کرنے کیلئے "علم و عمل کی باتیں" عنوان کے تحت کتنی علمی باتیں کی گئیں اور کتنے سوالات قائم کئے گئے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ الغرض یہ نصاب محض اور محض ایک فکر کی ترجمانی کر رہا ہے۔

مزید برآں نصاب کے ابتدائی حصے اس انداز سے ترتیب دیئے گئے ہیں کہ بچوں کی ذہنی تربیت ابتداء ہی سے ایسی کر دی جائے کہ پھر اسے آسانی سے بدلا نہ جا سکے، اس لئے شروع میں صرف ایسی سورتیں لائی گئی ہیں جن میں صرف عقیدۂ توحید کے ساتھ ساتھ زیادہ تر کفر و شرک اور معبودان باطلہ کی مذمت کی گئی۔ جبکہ سورۂ توبہ اور سورۂ منافقون ایسی سورتوں کو بھی شروع میں ان کے ساتھ لانا چاہئے تھا تاکہ جہاں عقیدۂ توحید و آخرت کی اہمیت اور کفر و شرک کی مذمت کا بیان ہو وہاں تعظیم و توقیر انبیاء علیہم السلام کی اہمیت اور توہین رسالت کے عبرت ناک انجام سے بھی طلباء ساتھ ساتھ واقف ہوتے رہتے۔ مگر اس کے برعکس کیا گیا کہ ان سورتوں کو نصاب کے آخری حصے میں شامل کیا گیا کہ زیادہ تر طلباء بالخصوص طالبات تو پہلے ہی اپنی تعلیم ترک کر دیتی ہیں اور اگر مکمل کریں بھی تو ان کا ذہن اتنا پختہ ہو چکا ہوگا کہ اب وہ ان سورتوں کے صحیح مفہوم کو سمجھنے سے قاصر ہو چکے ہوں گے اور اسے قبول کرنے کی طرف آمادہ ہی نہیں ہوں گے۔

مطالعہ قرآن حکیم حصہ اول میں چھ انبیاء کرام کے قصے بیان کئے گئے ہیں جن میں پہلا قصہ، قصہ حضرت آدم علیہ السلام ہے۔ اس کا نام اگر قصہ حضرت آدم علیہ السلام کی بجائے خطاء آدم ہوتا تو اس کتاب کیلئے زیادہ مناسب ہوتا کیونکہ اس قصہ میں حضرت آدم علیہ السلام کی دو عظمتوں (۱) حضرت آدم علیہ السلام کا خلیفۃ اللہ فی الارض ہونا۔ (۲) انکا دست قدرت سے تخلیق ہونا۔ کے حوالہ سے

قرآنی آیات شامل ہی نہیں کی گئیں کہ کہیں طالب علم کا ذہن عظمت وشان وشوکت آدم سے آشنا نہ ہوجائے۔ بلکہ اس قصہ میں انکی لغزش، خطا اور اس پر انکی توبہ کرنے کا ذکر ہے۔ یہاں سورت الاعراف میں ان کے مسجودِ ملائکہ ہونے کا ذکر تو آیا ہے، رہا آپکے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کا ذکر جو سوۂ بقرہ شریف میں ہے اور سورۂ حجر و سورۂ ص میں حضرت آدم علیہ السلام کے دست قدرت سے تخلیق فرمائے جانے اور نفخ روح کا ذکر ہے اسے بھی قصہ حضرت آدم علیہ السلام میں اسی انداز پر بیان کیا جانا چاہئے تھا۔ جیسا کہ قصہ حضرت نوح علیہ السلام، قصہ حضرت صالح علیہ السلام، قصہ حضرت ہود علیہ السلام، قصہ حضرت لوط علیہ السلام اور قصہ حضرت شعیب علیہ السلام کو بیان کرنے کیلئے مختلف سورتوں سے متعلقہ آیات جمع کی گئیں ہیں مگر انبیاء کرام کی عظمت کا بیان غالباً اس فاؤنڈیشن کے خاص مقاصد کو فوت کر دینے کے مترادف ہوتا۔

ایک اور سیاست یہ کی گئی کہ وہ کتاب جو بچے پڑھیں گے اور یاد کریں گے۔ میری مراد ''مطالعہ قرآن حکیم برائے طلباء وطالبات'' ہے۔ اس میں عظمت انبیاء علیہم السلام واولیاء کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو صحیح طور پر واضح نہیں کیا جبکہ اپنے آپ کو الزام سے بچانے کیلئے رہنمائے اساتذہ جو محض اساتذہ کی رہنمائی کیلئے ترتیب دی گئی ہے اس میں کہیں کہیں ایسی تفصیل دے دی گئی ہے جو عظمت انبیاء کو واضح کرتی ہے۔ اصل مقصد تو طلباء کو یاد کروانا ہے اور طالب علم تو اسی کتاب سے یاد کرے گا جو اس کے پاس ہوگی۔ اس صورت میں طلباء کے ذہن میں عظمت وعصمت انبیاء کیسے نقش ہو سکتی ہے اور وہ توہین رسالت سے کیسے بچ سکتا ہے۔

چند تجاویز:

ہماری گزارش یہ ہے کہ چونکہ یہ نصاب ایک مخصوص مکتبِ فکر کے افراد نے ترتیب دیا ہے اور اس پر جن علماء نے تائیدی سٹرفکیٹ دیئے ہیں انہوں نے صرف جاذب نظر عنوان اور دِل فریب کام کو سرسری طور پر دیکھ کر اس پر تعریفی اسناد جاری کر دی ہیں۔ کاش پہلے وہ باریک بینی اور فراستِ ایمانی سے اس کا جائزہ لیتے پھر اس پر اپنے تائیدی اور تنقیدی تاثرات قلم بند کرتے تو صورت حال کچھ اور ہوتی۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے بالغ النظر علماء کا ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جو علوم قرآن پر بھی گہری نظر رکھتے ہوں اور شان الوہیت اور ناموس رسالت کے تقدس سے بھی بخوبی واقف ہوں وہ اس نصاب کا بغور جائزہ لیں اور اس میں توجہ طلب مقامات کے تراجم اور تشریحات پر سنجیدگی سے غور کریں اور قابل اعتراض الفاظ اور کلمات کا محاسبہ کر کے ایسا انداز کلام اختیار کریں جو شان الوہیت کے تقدس اور ناموس رسالت کے تحفظ کا پاس دار ہو۔

اسی طرح جہاں توحید اور شرک کو بیان کیا گیا ہے وہاں اس چیز کی وضاحت ہونی چاہئے کہ انبیاء سابقین علیہم السلام کے زمانے میں جو شرک تھا وہ بت پرستی کی بناء پر ہوا کرتا تھا۔ کسی ایک شخص کو بھی کسی نبی کی تعظیم بجالانے کی بناء پر مشرک قرار نہیں دیا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی معیت کے حصول کو اعمالِ صالحہ کے ساتھ ساتھ تعظیم وتوقیر انبیاء سے مشروط قرار دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَکُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ (سورۃ المائدہ ۱۲)

(اور اللہ نے فرمایا بے شک میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور ایمان لائے میرے رسولوں پر اوران کی نصرت آمیز تعظیم کرتے رہے) اور قرآن حکیم کے اول مخاطبین حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جن کے ایمان کو معیار ہدایت قرار دیا گیا ہے اور جو کفر وشرک کی شدید گمراہیوں سے گزر کر حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ ہم سے زیادہ شرک کی خرابیوں سے واقف تھے۔ان کے تعظیم وتوقیر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جذبہ کا عالم یہ تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موئے مبارک اور مبارک ناخنوں اور آپ کی دیگر مستعملہ اشیاء کو صرف باعث برکت ہی نہیں جانتے تھے بلکہ انہیں اپنے لئے حرز جان سمجھتے اور غزوات وغیرہ میں انہیں اپنی کامیابی کی ضمانت گردانتے تھے،ان سے اپنے مریضوں کا علاج اور اپنی بیماریوں سے شفاء حاصل کرتے تھے۔ وہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لعاب مبارک وغیرہ کو بھی زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے بلکہ انہیں اپنے جسموں اور چہروں پر مَل لینے کو باعث سعادت سمجھتے تھے جبکہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی اور ذوالخویصرہ وغیرہ جیسے توحید کے علمبردار گستاخِ رسول ہوکر جہنم واصل ہوئے۔

ہمارے اس تجزیئے سے ہرگز یہ نظریہ قائم نہ کیا جائے کہ تعلیم قرآن کو عام کرنے کے اس اہم منصوبے کے نفاذ میں ہم رکاوٹ ڈال رہے ہیں یا یہ کہ ہم اسکے مخالف ہیں (العیاذ باللہ) بلکہ یہ تو ہمارے پاکستان کے بانی علماء ومشائخ کا ہی دیرینہ مطالبہ رہا۔لہٰذا ہم اس منصوبے کے بھرپور حامی اور معاون ہیں۔ ہمارا ارباب اقتدار سے یہ مطالبہ ہے کہ اس منصوبے کو جلد از جلد صحیح خطوط اور دین قیم کے طور پر پایۂ تکمیل کو پہنچایا جائے،اس کے لئے انہیں ہمارا مکمل تعاون حاصل ہوگا۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ جب ہر مکتب فکر کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ توہین رسالت ناقابل معافی جرم ہے اور اسی طرح جب یہ بات مسلم ہے کہ بعد از اظہار نبوت ہر نبی معصوم عن الخطا ہوتا ہے تو عصمت انبیاء کو بھی جگہ جگہ واضح کیا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ صراحتاً تو درکنار اشارۃً اور کنایۃً بھی توہین رسالت کا رائی برابر شائبہ تک نہ ہو کیونکہ ارباب حل وعقد کے فرائض میں یہ شامل ہے کہ وہ اقامتِ صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ کے اہتمام کے ساتھ ساتھ امر بالمعروف و نھی عن المنکر کے تقاضوں کو پورا کریں،لہٰذا ناموس رسالت اور عقیدۂ عصمت انبیاء کا تحفظ جو کہ تقاضۂ ایمان اور ضروریات دین سے ہے اس نصاب میں اس کا التزام بھی ان کا بنیادی فرض ہے کیونکہ یہ عام کتاب نہیں بلکہ مطالعہ قرآن پر مشتمل نصاب ہے اس میں حددرجہ غور وفکر اور احتیاط کی ضرورت ہے۔اس کی مفت فراہمی کو خاطر میں نہ لائیں کہ اس قدر وافر مقدار میں یہ نصاب بلا معاوضہ مل رہا ہے اس لئے اس میں کوئی حرج نہیں بعد میں دیکھا جائے گا۔

اگر یہ نصاب من وعن تعلیمی اداروں میں نافذ کیا گیا تو اس کے نتیجہ میں سچے پکے مسلمان تو کیا تیار ہوں گے اور محبّ وطن شہری بھی شاید تیار ہوسکیں یا نہ ہوسکیں البتہ بقول اقبال کہ

ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی تعلیم فراغت ؎ کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

ایسے کلمہ گو ضرور پیدا ہوں گے جن کا نام کی حدتک توحید ورسالت پر ایمان تو ہوگا لیکن ان کے دلوں میں حضرات انبیاء کرام

علیہم السلام بالخصوص صاحب قرآن، باعث تخلیق کائنات، محبوب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت و رفعت نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی ۔

اگر ان امور کا سنجیدگی سے جائزہ لیکر تدارک نہ کیا گیا تو یہ نصاب ملی وحدت و یگانگت کے اظہار کی بجائے مزید افتراق و انتشار کا سبب ہوگا اور اسکے اس سے بھی زیادہ بھیانک نتائج سامنے آئیں گے جن کا گزشتہ ڈیڑھ صدی سے امت مسلمہ بالعموم اور مسلمانان پاک و ہند بالخصوص سامنا کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان اختلافات کا بنیادی سبب بھی شان الوہیت و شان رسالت میں تنقیص پر مشتمل ایسی ہی عبارات ہیں کوئی زمینوں اور جائیدادوں کا جھگڑا نہیں۔ اصل مسئلہ تو شان الوہیت اور ناموس رسالت کے تقدس اور تحفظ کا ہے جس پر کوئی سچا مسلمان اور محبّ رسول مومن کسی طرح کی کوئی مفاہمت نہیں کرسکتا۔

سید ارشد سعید کاظمی

خادم الحدیث جامعہ انوار العلوم ملتان پاکستان

۲۹ ستمبر ۲۰۱۶ ء

دربارِ عالیہ سعیدیہ کاظمیہ

مرکزی شاہی عیدگاہ ملتان میں ہر جمعۃ المبارک کو

(نمازِ عصر تا مغرب)

محفل درودِ بحر الکمال منعقد ہوتی ہے۔

(اور بعد نمازِ مغرب)

درسِ قرآن و درسِ بخاری دیا جاتا ہے۔

اپنی قلبی و روحانی تسکین کیلئے اس میں خود بھی شرکت فرمائیں اور دوست احباب کو بھی ساتھ لائیں۔

پاکستانی وقت کے مطابق بعد نمازِ عصر